اُردو نثر میں حبسیہ عناصر......ایک مطالعہ

مسز صائمہ علی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، بنک روڈ کیمپس، لاہور

Abstract

This research article deals with the Urdu prison prose, a narrative produced by a captive while imprisoned or after liberation. Prison prose in inculcates both the external and internal impacts of imprisonment on the human psyche. Usually the latter effect dominates the authors unconsciousness and hinders the objectives analysis to take it place in prison prose. This study analyses both the peripheral and inner events of captive's mind.

جرم و سزا کا عمل انسانی زندگی کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا- روئے ارض پر انسانی زندگی کی ابتدا حضرت آدمؑ کی سزا کے نتیجے میں شروع ہوئی تھی- انبیائے کرام میں حضرت یوسف علیہ السلام کو انکارِ گناہ پر طویل قید کاٹنی پڑی- سردار انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اعلان نبوت کے بعد تین سال اپنے ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا- سن ۶۱ ہجری میں انسانی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا معرکہ کربلا کے ریگ زار میں پیش آیا تو یزید نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ کو ایک سال شام کے زنداں میں اسیر رکھا جہاں اسیری کے شدائد سے امام حسینؑ کی چار سالہ صاحبزادی انتقال کر گئیں- تاریخ اسلام مشاہیر کی قید سے بھری پڑی ہے- حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جب خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کی تو امام ابو حنیفہؒ، امام تیمیہؒ کو قید خانے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور زہر خورانی کے باعث قید میں ہی شہید ہوئے- امام حنبلؒ بھی ڈیڑھ سال اسیر رہے- امام موسیٰ کاظم، منصور دوانقی اور ہارون الرشید کے زمانے میں چودہ سال اسیر رہے اور وہیں شہادت پائی- شخصی حکومتوں میں اپنے مخالف کو زنداں میں بھیجا غیر معمولی فعل نہیں رہا- برصغیر میں مسلم حکمرانوں نے اس روایت کو نبھایا- انگریزی تسلط کی باقاعدہ ابتدا ہی جنگ آزادی کے نتیجے میں ہوئی تھی- چنانچہ انگریز حکومت کا رویہ عوام سے جابرانہ تھا- برصغیر کی مختلف قوموں نے تحریک آزادی کی جدوجہد جاری رکھی جس کے نتیجے میں حریت پسند آواز کو کثرت سے پابند سلاسل کیا گیا-

قید خانہ ایسی جگہ ہے جہاں انسان کا جسم تو قید ہوتا ہے لیکن فکر پہلے سے زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ گردش تقدیر سے عادی مجرموں کے ساتھ ساتھ اہلِ فکر، اہلِ نظر اور اہلِ قلم بھی اسیرِ زنداں کیے جاتے ہیں- قید خانے میں ایک ذی شعور انسان کے لیے بہت سامانِ فکر موجود ہوتا ہے یہاں انسان کا قلب و نظر کھل کر سامنے آتا ہے- زندگی کے ناپائیدار ہونے کے احساس، اپنے

اعمال کا جائزہ لینے، دہر سے عبرت حاصل کرنے اور خود احتسابی کے لیے قید خانہ بہترین جگہ ہے- اس کے ساتھ یہاں وقت کی بھی فراوانی ہوتی ہے- اس لیے ہر حساس اور ذی شعور انسان اسیری کے تجربات و مشاہدات کو تحریری شکل دینے کی کوشش کرتا ہے- اس نوع کی تحریریں حبسیہ ادب کی ذیل میں آتی ہیں۔

حبسیہ نثر سے مراد وہ تحریر ہے جو قید میں رہ کر یا بعد میں قید سے متعلق لکھی گئی ہو اور جن کا انداز شخصی ہو۔ قید میں رہ کر غیر شخصی تحریر حبسیہ نثر کی ذیل میں نہیں آتی۔

حبسیہ نثر کے لیے کسی مخصوص صنف کی قید نہیں۔ اس کے نمونے آپ بیتی[۱]، خطوط[۲]، رپورتاژ[۳]، سوانح عمری[۴]، سفر نامہ[۵] اور انٹرویو[۶] کی صورت میں ملتے ہیں۔

اُردو نثر میں حبسیہ عناصر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پہلی کتاب مولوی جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' ہے جو ۱۸۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔ -مکمل کتاب کے علاوہ متفرق صورتوں میں اس کا وجود اس سے بھی پرانا ہے- مثلاً بہادر شاہ کی جلاوطنی کے زمانے میں رنگون سے لکھا گیا ان کی بہو شاہ زمانی بیگم کا خط ملتا ہے جس میں سابق تاج دار ہندوستان کے ولی عہد کی بیوی المناک انداز میں اپنی ماں سے اسیری کی کیفیات بیان کرتی ہے۔ اس ایک خط میں درد، غم، اسیری اور لاچاری کی جو کیفیات ملتی ہیں وہ اسیری کی مکمل کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔[۷]

حبسیہ نثر کی نمایاں خصوصیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) اسیری کا خارجی پہلو:

۱- متعلقات اسیری
۲- قید کے مشاغل
۳- تشدد کا بیان
۴- قید خانہ کے منتظمین اور ساتھیوں کا ذکر
۵- قید کا سیاسی پس منظر

(ب) اسیری کا داخلی پہلو:

۱- اسیری کے مصائب کا بیان
۲- اسیری کے مثبت تجربات
۳- نظریہ اسیری
۴- مذہبی رجحان
۵- بے گناہی - اُمید

اسیری کا خارجی پہلو

۱- متعلقاتِ اسیری:

ہر ادارے یا پیشے کی طرح جیل کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں جو ایک نو وارد کے لیے غیر مانوس ہوتی ہیں حبسیہ نثر نگاروں نے لطیف اور حساس دونوں قسم کے پیرائے میں اس کا استعمال کیا ہے مثلاً جیل کی اصطلاحات میں سب اچھا ہے، ٹوٹل پورا، اول تنہائی، دوم تنہائی، سیاست خانہ، اڑوی بدلنا، کھولی بند، گنتی، ڈلو، مشققی، قصوری چکی وغیرہ اہم ہیں- حالات و واقعات سے ان الفاظ کے تفاوت کو حمید اختر نے بڑے کرب سے بیان کیا ہے، ''کال کوٹھڑی'' میں لکھتے ہیں:

> ''جب اس دوم تنہائی کے نمبردار نے چیخ کر سب اچھا کہا تو میرا دل چاہا کہ چیخ کر کہوں ''ادھر سب اچھا نہیں نے، اِدھر تو بڑا کرب اور درد ہے- ادھر ایک کالی کوٹھڑی میں ایک ادیب پڑا سو رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو سب اچھا-''۸

شورش کاشمیری بھی جیل میں گشت کرنے والے سپاہیوں کی طرف سے ''سب اچھا ہے'' کے بلند الفاظ کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ جن کا مقصد ہوتا ہے کہ قیدی پورے ہیں، کوئی ہنگامہ نہیں اس کے علاوہ چاہے قیدی کتنی تکلیف میں ہو وہ ''سب اچھا ہے'' کا راگ الاپتے ہیں۔ شورش اس کے متعلق طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''سترہ بیمار، تین مر گئے، ایک نزع میں، باقی سب اچھا ہے''-۹

قید خانے کی ناہموار زندگی کسی کے لیے بھی خوشگوار نہیں ہوتی لیکن ان ناہمواریوں سے سمجھوتہ کر کے ان کا شگفتہ انداز میں ذکر یقیناً کوئی صاحب دل ہی کر سکتا ہے- صدیق سالک حبسیہ نثر کی تاریخ میں واحد مزاح نگار ہیں- مزاح نگار ہمیشہ ناہموار اور غیر متوقع صورتحال میں مزاح کے پہلو تلاش کرتا ہے- بھارتی جیل میں غسل کی غیر تسلی بخش سہولت پر جھنجھلانے کے بجائے لطیف انداز میں لکھتے ہیں:

> ''بھارتی لطف و عنایات کا دور چلا تو اگلے روز ایک اور کارندہ کپڑے دھونے کا صابن لے آیا- ایک انچ لمبا، ڈیڑھ انچ چوڑا ساتھ ترکیب استعمال یہ بتائی کہ سامنے غسل خانے میں چلے جاؤ، اسی ٹکڑے سے نہا لو اور کپڑے بھی دھو لو- میں نکل پڑا تو خیال آیا کہ کُرتہ پاجامہ دھو ڈالا تو پہن کر کیا نکلوں گا- چنانچہ اسی کارندے کے لطف خاص سے کمبل کا ایک ٹکڑا ساتھ لیا غسل خانے میں جا کر جسم و جاں اور جامہ و پیرہن کو بیک وقت بھگو ڈالا لیکن صابن تھا کہ خیالِ یار کی طرح پھسل پھسل جاتا اور میل تھا کہ رقیب روسیاہ کی طرح پیچھا نہ چھوڑتا تھا-''۱۰

ظفر اللہ پوشنی ''پنڈی سازش کیس'' کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے پندرہ لوگوں میں شامل تھے پیشے کے لحاظ سے وہ فوجی تھے لیکن اُن کی کتاب ''زندگی زنداں دلی کا نام ہے'' میں قید کے متعلق شگفتہ رویہ اور اسلوب ملتا ہے۔ وہ قید کے کھانے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ہم کھانا کھانے کے لیے بنچ کے اردگرد بیٹھ گئے تانبے کی تھالی میں سوکھی ہوئی ٹھنڈی روٹیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دو گہری رکابیوں میں کوئی شوربہ نما سیال تیر رہا تھا۔ تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں دال کے چند

دانے بھی تہہ نشین ہیں۔''[۱۱]

۲- قید کے مشاغل:

قید کے بے مصرف دنوں میں قیدی کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنا لیتے ہیں جن میں سب سے اہم تو مطالعہ ہے- خواندہ قیدی اپنی استطاعت کے مطابق کسی نہ کسی قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے- ان میں مذہبی موضوعات پر کتابیں اہم ہوتی- اس کے علاوہ دوسرے مذاہب کی کتابیں پڑھنے اور دوسری زبانیں سیکھنے پر بھی اکثر قیدی توجہ دیتے ہیں-

جانوروں، پرندوں حتیٰ کہ حشرات الارض سے بھی قید میں انسیت ہو جاتی ہے- ابوالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' میں پرندوں کا قریبی مشاہدہ کیا ہے بعد کے نثر نگاروں نے اس انداز کی پیروی کی ہے اس کے ساتھ جیل میں انسان چند مخصوص چہروں کے علاوہ زندگی کو محسوس کرنے سے محروم ہو جاتا ہے ایسے میں یہ جانور پرندے قیدی کو زندگی کا احساس دلاتے ہیں- فیض احمد فیض نے اپنی کتاب میں خصوصیت سے ایک بلی کا ذکر کیا ہے جس کی تیسری نسل اُن کے سامنے بڑی ہوئی- ان کے مطابق اس بلی سے سب کے ''مادر و پدرانہ جذبات'' کی تسکین ہوتی تھی-

اسیری کا سب سے اہم مشغلہ باغبانی ہے جس کا ذکر اکثر مصنفین نے کیا ہے- پھول یقیناً خوب صورت ہوتے ہیں جسے دیکھ کر طبیعت میں شگفتگی آتی ہے لیکن قیدیوں میں اس کی پسندیدگی کی بڑی وجہ اُمید کی کیفیت ہے جب انسان محنت کر کے زمین نرم کرتا ہے بڑے شوق سے بیج بوتا ہے تو ساتھ ہی موسم گل کا انتظار شروع کر دیتا ہے اور جب پھول کھلتا ہے تو گرد و پیش کی تلخی کچھ دیر کے لیے کم ہوتی محسوس ہوتی ہے جاوید ہاشمی نے سات سالہ اسیری میں اس مشغلے کو جی جان سے اپنایا- اڈیالہ جیل سے لاہور منتقل ہونے پر صرف اس لیے ہفتوں اداس رہے کہ وہاں لگائے پھولوں کی بہار نہیں دیکھ سکے، لکھتے ہیں:

> ''مجھے اڈیالہ جیل میں لگائے چمپا، چنبیلی اور موتیا کے پودے بہت یاد آتے ہیں جو یہاں کوشش کے باوجود میسر نہیں آ سکے- پھولوں کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے ان کا کھلنا اور مسکرانا ہی ان کا جوہر کامل ہے- وہ فضاؤں کو معطر کر کے ایک دو دن کے اندر موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں مگر جو مسرتیں وہ بکھیرتے ہیں اسی میں زندگی کا پیغام ہوتا ہے- فنا تو ہر ایک شے کو ہونا ہے تو پھر ہم پھولوں کی طرح خوشبو پھیلا کر دنیا سے رخصت کیوں نہ ہوں-''[۱۲]

۳- تشدد کا بیان:

جیلوں میں تشدد کوئی نہیں بات نہیں امریکہ جیسے جمہوری ملک نے ابوغریب جیل میں قیدیوں پر جو غیر انسانی تشدد کیا، متمدن سوچ اس کے تصور سے کانپ جاتی ہے- حبسیہ نثر میں اس ضمن میں دو رویئے سامنے آئے ہیں- بعض مصنفین خود پر ہونے والے تشدد کو بڑھ چڑھا کر بیان کرتے ہیں- ان میں سرفہرست شورش کاشمیری ہیں جو تشدد کی عکاسی میں کمال رکھتے ہیں- وہ ٹیپ کے مصرعے کی طرح تشدد کا بیان بار بار کرتے ہیں- شورش، دریدہ واقعات کے بدن کو الفاظ کا لباس عطا کرنے کے حق میں نہیں- اس کی وجہ شائد اُن کا صحافتی پس منظر بھی ہے جہاں واقعے کو خبر بنانے کے لیے شدت بیاں ضروری تصور کی جاتی ہے- شورش جیل حکام کی اُن کے یا اُن کے اہل خانہ کے متعلق نازیبا گفتگو بھی جوں کی توں بیان کرتے ہیں- حبسیہ نثر کے اس انداز

کے جواز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت کا بیان ضروری ہے لیکن اگر ان واقعات کے براہ راست بیان کے بجائے اس سے مطلوبہ تاثر اور کیفیت کو بیان کیا جائے تو یہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسا حمید اختر نے ''کال کوٹھڑی'' میں کیا ہے۔

تشدد کے معاملے میں اگر مصنف کے مبالغے کے تناسب کو پیش نظر رکھیں تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جیلوں کا ظالمانہ نظام اصلاح کے بجائے جرم کی پرورش کرتا ہے۔ جیل مینول کا سرسری مطالعہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے جہاں کل اختیار سپرنٹنڈنٹ کو حاصل ہے۔ جیل ضابطے میں قیدیوں کے قصور کی اتنی مبہم تفصیل دی گئی ہے جس پر کوڑے مارے جانے جیسی سخت سزا کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً پاکستان میں ''جیلوں کے قواعد وضوابط'' نامی کتاب میں قاعدہ نمبر ۵۸۸

(۱)　کوڑے مارنے کی سزا سنگین جرائم (اسلامی حدود) کے لیے رکھی جائے گی اور اگر کوڑے لگائے جائیں تو وہ اتنے سخت ہوں گے کہ جرم سے باز رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں اگر میڈیکل افسر تصدیق کر دے کہ قیدی اتنے کوڑے برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو مجھے کوئی اور سزا دی جائے۔

(۲)　کوڑوں کی سزا صرف بغاوت کی بناء پر یا ایسے رویئے کی بنا پر جس سے جیل کا ڈسپلن متاثر ہوا ہو، یا سرکاری ملازموں یا ملاقاتیوں پر شدید حملہ کرنے کی صورت میں یا جب دوسری سزائیں سنگین جرائم کرنے کے سلسلے میں ناکام ہو چکی ہوں، دی جائے گی۔'' ۱۳

''بغاوت''، ''ڈسپلن کی خرابی'' یا ''شدید حملے'' کی کوئی جامع تعریف نہیں۔ سولہ سال سے کم عمر قیدیوں کو بھی کوڑے لگانے کی اجازت ہے البتہ کچھ نرمی کے ساتھ جس کا ذکر قاعدہ نمبر ۵۸۹ شق نمبر ۲ میں کیا گیا ہے۔ ۱۴

قاعدہ نمبر ۵۷۱ کی رو سے جیل کے جرائم میں کچھ ایسے نکات ہیں جسے اپنی مرضی سے جرم قرار دے سکتا ہے اس کی واضح شکل متعین نہیں مثلاً:

۱۔　جان بوجھ کر اپنے آپ کو محنت کے ناقابل بنانا۔
۲۔　بیماری کا بہانہ کرنا
۳۔　غیر اخلاقی یا نازیبا رویہ
۴۔　کسی افسر یا قیدی پر جان بوجھ کر جھوٹا الزام لگانا
۵۔　جس قیدی کو قید بامشقت کی سزا دی گئی ہو اس کا جان بوجھ کر کسی کام میں سستی یا لاپروائی کرنا۔
۶۔　جس قیدی کو قید بامشقت کی سزا دی گئی ہو اس کا جان بوجھ کر کسی کام میں بدانتظامی کرنا۔ ۱۵

ان وجوہات کی وجہ سے اکثر مصنفین نے جیل کے غیر منصفانہ نظام کا ذمہ دار جیل حکام کے بجائے جیل مینول کو قرار دیا ہے۔ شورش کاشمیری ۱۹۳۵ء کی قید کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جس اندھے شخص نے جیل مینول بنایا تھا اس نے صرف انتقام وسزا کو سامنے رکھا اور کچھ سوچا ہی نہیں۔ نہ وہ انسان کی داخلی سرشت سے واقف تھا جو عام لوگوں میں مشترک اور اٹل ہوتی ہے نہ وہ قیدیوں کی اصلاح کا خواہاں تھا۔'' ۱۶

پچاس سال بعد حمید اختر کی رائے جیل مینول کے بارے میں یہی ہے، لکھتے ہیں:

''۱۹۸۱ میں .... وہاں جا کر معلوم ہوا کہ جیلوں کے حالات ویسے ہی ہیں جیسے چالیس برس پہلے تھے۔ تھوڑی بہت اصلاحات ہوتی رہی ہیں مگر ہر دفعہ قیدیوں کو حقوق دینے کی بات جیل کے حکام کی منظوری کے ساتھ مشروط کر دی جاتی ہے۔ جیل کا نظام چلانے والی بنیادی دستاویز ''جیل مینول'' ہے جو دورِ غلامی کی یادگار ہے اور ویسے ہی موجود ہے ضرورت اس کو تبدیل کرنے کی ہے۔''[۱۷]

تشدد کے ضمن میں دوسرا رویہ خود پر ہونے والے تشدد اور بدسلوکی کے ذکر کو نہ بیان کرنے کا ہے۔ اس معاملے میں مصنف غالباً اپنی عزتِ نفس اور انا کو ٹھیس لگنے کے خدشے کے تحت حکام کی بدسلوکی اور بدزبانی کو براہِ راست بیان نہیں کرتا مثلاً جاوید ہاشمی اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ نیب نے ان پر تشدد کیا اور اُن کا ایک ساتھی اس تشدد سے جان کی بازی ہار گیا لیکن اس تشدد کا براہِ راست بیان نہیں کیا۔ صدیق سالک اس معاملے میں ایک قدم آگے محسوس ہوتے ہیں۔ اپنی کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں انہوں نے ایک جگہ بھی خود بھی ہونے والے تشدد کا ذکر نہیں کیا لیکن اپنی آپ بیتی ''سلیوٹ'' میں بھارتی قید کا ذکر کرتے ہوئے عمومی انداز میں مار پیٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ دو انتہائی رویئے انسانی نفسیات کو ظاہر کرتے ہیں، یہ انداز آپ بیتی کے مزاج میں بھی پایا جاتا ہے جہاں بعض مصنف اپنی خامیوں کو گھٹا کر اور بعض بڑھا کر بیان کرتے ہیں یا ایک ہی مصنف زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بیان میں مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔ حبسیہ نثر ایک اعتبار سے آپ بیتی کی ذیلی شکل ہے اس لیے آپ بیتی کی خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس پہلو کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

''آپ بیتی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغے سے کام لیتا ہے۔''[۱۸]

۴۔ قید خانہ کے ساتھیوں اور منتظمین کا رویہ:

حبسیہ نثر میں چونکہ منظر نامہ محدود ہوتا ہے اس لیے ساری دنیا سے کٹ کر جو چند افراد مصنف کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کو وافر وقت ملتا ہے۔ اس معاملے میں بھی دوسرے پہلوؤں کی طرح مصنف کی شخصیت اہم ہوتی ہے جو شخص عام زندگی میں جیسے مزاج کا ہوگا تحریر میں اس کا عکس نظر آئے گا مثلاً ابوالکلام آزاد طبعاً کم سخن اور تنہائی پسند انسان تھے انہوں نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں جن میں نہرو بھی شامل تھے کا ذکر نہ ہونے کے برابر کیا ہے۔ جیل حکام میں سے ایک انگریز افسر کا مختصر ذکر البتہ شگفتہ انداز میں کیا جسے انہوں نے ''چیتا خان'' کا نام دیا تھا۔

صدیق سالک بہت معاشرتی اور دوست دار انسان تھے انہوں نے قید خانے کے ساتھیوں کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا ہے جن میں سے بعض پر افسانوی کردار کا گمان ہوتا ہے مثلاً سیکنڈ لیفٹیننٹ اعجاز رضوی اس کے ساتھ انہوں نے بھارتی جیل حکام کا ذکر بھی لطیف انداز میں کیا ہے۔ سالک اپنے معتوب کرداروں کا تعارف و تجزیہ زیادہ دلچسپ انداز میں کرتے ہیں مثلاً:

''بے شک وہ اپنی ماتا کی آنکھ کا تارا ہوگا لیکن ہمیں ایک آنکھ نہ بھایا لمبے قد پتلی ٹانگوں اور موٹے پیٹ کی وجہ سے اکثر چلتے وقت اس میں کسی اناڑی شاعری کے بے وزن مصرعے کی طرح جھول پڑتی۔''[۱۹]

جیل میں یقیناً عام انسان نہیں جاتے چاہے وہ کسی منفی سرگرمی میں غیر معمولی ہوں اس لیے ایک حساس ادیب ان اشخاص کے رویوں کی عکاسی عام انسانوں کی نسبت بہتر انداز میں کر سکتا ہے۔ حبسیہ نثر کی کردار نگاری اس لحاظ سے منفرد ہے کہ

یہاں انسان دو واضح گروہوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ حبسیہ مصنفین کی اکثریت کے نزدیک جیل حکام بدی کے نمائندہ ہوتے ہیں اس کے مقابلے میں قیدی عموماً بے گناہ اور مظلوم محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں غیر جانب داری قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً جیل حکام کی کردار نگاری میں حمید اختر جانب دار معلوم ہوتے ہیں- اُن کی مختلف کیفیات ونظریات دکھانے کے باوجود اس ضمن میں ان کی مجموعی رائے منفی ہے جو بالواسطہ جیل کے نظام سے نفرت کا نتیجہ ہے- اس کے برعکس قیدیوں یا ماتحت عملے کی کردار نگاری میں یہ انداز نہیں۔ وہ جیل کے نظام، قوانین کو تمام مسائل کی جڑ سمجھتے ہیں- کسی قیدی کے قبیح افعال پر کبھی تنقید نہیں کرتے بلکہ جس قیدی کا جرم جتنا بڑا ہے اُسی نسبت سے اُن کی ہمدردی اس کے لیے زیادہ ہے- اس اعتبار سے سب سے زیادہ زورِ قلم سزائے موت کے قیدیوں کا حالِ زار بیان کرنے پر صرف کیا ہے- اس کا نفسیاتی سبب یہی نظر آتا ہے کہ وہ خود قید کی اذیت سہہ رہے تھے- قیدی کی سزا پر تو انہیں بہت ہمدردی ہوتی ہے لیکن قیدی کے جرم کی بنا پر کبھی نفرت کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا- اس ضمن میں وہ اول تا آخر معاشرے کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں مثلاً:

> ''کاش ہم یہ سوچ سکیں کہ حیات محمد نے قتل کیوں کیا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کی جہالت، اس کی صدیوں کی غلامی، اس کے وحشیانہ جذبات جنھیں تہذیب کی بھٹی میں جلا کر قابو میں رکھنا نہیں سکھایا گیا تھا، سبھی اس قتل کے ذمہ دار تھے جو حیات محمد نے کیا تھا- یہ قتل سماج کی ذمہ داری ہے- وہ سماج جس نے حیات محمد کو جنم دیا اور قتل کرنے تک کی عمر اور عقل تک پہنچایا وہ اس کا ذمہ دار ہے- پھر اس قتل کے بعد اس قتل کے لیے ایک اور آدمی کیوں مار دیا گیا؟''[۲۰]

اس طرزِ فکر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جرم کا سبب تو سماج ہے اور مجرم قید خانے میں بے جرم اذیت کا سزاوار ہے- اس ضمن میں وہ ظالمانہ قوانین کو بھی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو انسان کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتے-

حقیقی کرداروں کی عکاسی میں بعض اوقات ان کے اندر کا افسانہ نگار باہر آ جاتا ہے اور وہ ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جو افسانے میں بھی مناسب نہیں ہوتا یعنی کردار مصنف کی زبان میں گفتگو کریں مثلاً انہوں نے سزائے موت کے منتظر کے ایک ان پڑھ قیدی سے ایسی گہری باتیں کہلوائیں ہیں جو اس کے تعلیمی وتہذیبی پس منظر سے بعید ہیں- اس انداز سے نثر تو یقیناً خوب صورت اور موثر ہوئی ہیں لیکن حبسیہ نثر جس حقیقت نگاری کی متقاضی ہے ضرور متاثر ہوئی ہے- یہ انداز حمید اختر کے علاوہ دوسرے مصنفین میں بہت کم پایا جاتا ہے-

۵- قید کا سیاسی پس منظر:

پاکستان کے مخصوص سیاسی ماحول میں اخلاقی قیدی کی آپ بیتی یا روداد لکھنے کا رواج نہیں چنانچہ سب مصنفین سیاسی قیدی ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں وجہ اسیری کا سیاسی پس منظر بھی بیان ہوا ہے- اس کے ساتھ وہ اپنی تحریک کے نظریات کا بیان بھی کرتے ہیں- یہ بیان اگر حد سے بڑھا ہو تو اسلوب کی دل کشی کو متاثر اور مجروح کرتا ہے اور تحریر ذاتی واردات کے بجائے تحریک کا منشور معلوم ہوتی ہے- پروفیسر خورشید احمد نے اپنی کتاب میں جماعت اسلامی کی تعلیمات، حق پرستی کو شد ومد سے بیان کیا ہے جو شخصی تحریر میں ناخوشگوار محسوس ہوتا ہے- اتفاق سے وہ پوری مدتِ اسیری میں تحریک کے ساتھیوں کے ساتھ رہے اس لیے تحریک کا ذکر کتاب میں حاوی ہے- اس کے برعکس فیض احمد فیض مشہور ''پنڈی سازش کیس'' میں گرفتار ہوئے

لیکن ان کے ہاں اس سازش کے بارے میں لب کھولنے کا رجحان بالکل نہیں ہے۔ خورشید احمد نے ۴۰ (چالیس) صفحات میں مقدمے کی عدالتی کارروائی اور عدالت میں اپنے دلائل کا ذکر کیا ہے جبکہ فیض نے مقدمے پر آنے جانے کا تو مختصر ذکر کیا ہے لیکن عدالتی کارروائی پر مطلق بات نہیں کی۔ اسی طرح حمید اختر کے ہاں بھی ''پاکستان کمیونسٹ پارٹی'' اور ترقی پسند تحریک کا ذکر خال خال ہے۔

شورش کاشمیری نے بھی مختلف موقعوں پر اپنی وجہ اسیری کو کھل کر بیان کیا ہے وہ مختلف مقاصد کے تحت جیل گئے۔ مسجد شہید گنج کے انہدام کا معاملہ ہو یا کانگریس کی ہمنوائی، مجلس احرار کے ساتھ اینٹی قادیانی تحریک ہو یا ایوب خاں کی آمریت انہوں نے یہ پس منظر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حبسیہ نثر میں یہ بیان حد اعتدال میں نہ ہو تو وہ شخصی تحریر کے بجائے سیاسی تحریک کی روداد بن جاتی ہے۔

حبسیہ نثر میں سیاسی واقعات کے متعلق بعض مصنفین اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جو تاریخ سے متصادم ہوتا ہے۔ حبسیہ نثر میں اس نوع کے مباحث کا تجزیہ شامل نہیں لیکن یہ مباحث اس نثر کا اہم حصہ ہیں اس لیے ان کا مختصر ذکر کیا ہے مثلاً باچا خان نے پاکستان مخالف جذبات کا پس منظر بیان کیا ہے کہ وہ قیام پاکستان کے بعد دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تھے لیکن ان کے ساتھ محبت کا سلوک نہیں کیا گیا اس کی تائید دوسرے حبسیہ نثر نگاروں مثلاً حبیب جالب اور جاوید ہاشمی نے بھی کی ہے۔ ''پنڈی سازش کیس'' نہ صرف حبسیہ نثر بلکہ پاکستان کی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ اس میں پاک فوج کے چند افسر اور کمیونسٹ پارٹی کے کچھ لوگ شامل تھے۔ جنہیں عدالت سے سزا سنائی گئی ان میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض جیسے نام بھی شامل تھے۔ فیض نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی لیکن ویسے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔ خارجی واقعات، مخصوص پیشہ ورانہ تفصیلات حبسیہ نثر کو لطافت اور داخلیت سے دور لے جاتی ہیں اس نوعیت کے متنازعہ معاملات ادبی نہیں سیاسی تاریخ میں رقم ہونے چاہئیں۔

(ب) اسیری کا داخلی پہلو

۱۔ اسیری کے مصائب کا بیان:

اسیری یقیناً ایک تلخ اور اعصاب شکن تجربہ ہوتا ہے۔ قیدی کی حیثیت آزاد زندگی کے کمزور ترین انسان سے بھی نیچے ہوتی ہے۔ حبسیہ نثر کے اولین نمونے بہادر شاہ ظفر کی بہو شاہ زمانی بیگم کے خط میں جلاوطنی یا اسیری کے شدائد کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر پوری حبسیہ نثر میں نہیں ملتی۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''اب تو دِلّی واپسی کی کوئی اُمیّد نہیں۔ ہمارے اجداد پر سخت آزمائشیں آتی رہی ہیں۔ حضرت بابر پر ہم سے زیادہ مشکلات پڑ چکی ہیں مگر وہ اتنے مایوس نہ ہوئے تھے، جتنے ہم ہیں، کیونکہ اُن کی ہمت کے سامنے ساری دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اُن کی شمشیر میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے، ہزاروں، لاکھوں افراد اُن کی حمایت کے لیے آ کھڑے ہوتے تھے اور اُن کی مشکل دُور ہو جاتی تھی، مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہم درد معلوم نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہم دردی تبھی ہوتی ہے، جب ہم کسی کو کسی سے کچھ اُمیّد ہو۔ ہم سے کسی کو بھلا کیا امید ہوگی۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہو چکی، ہمارے

اقبال کا چراغ گُل ہو چکا، ہمارے سب حمایتی مر چکے، اب جو ہماری مدد کا ارادہ کرے گا یا ہم سے بھی ہم دردی کرے گا، اُسے قید ہو گی یا پھانسی، اور کوئی انعام و اکرام، ہم اُسے نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام حسینؓ کے قاتلوں کو یزید کے دربار سے بہت کم گزارا ملتا تھا۔ یعنی فی کس ڈیڑھ سیر جَو دیے جاتے تھے، اور قاتلوں نے محض ڈیڑھ سیر جَو کے لیے رسول اللہؐ کے نواسے کو قتل کر دیا۔ اگر حضرت امام حسینؓ ڈیڑھ سیر جَو شاہی فوج کے ہر آدمی کو دے سکتے تو وہ قاتل اُنہیں کے ساتھ ہو جاتے۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ آج ہم اپنے ہم دردوں اور حمایتیوں کو ڈیڑھ سیر جَو بھی نہیں دے سکتے، پھر ہم سے کوئی کیوں ہم دردی کرے اور ہماری حمایت کا خیال اُس کے دل میں کیوں آئے؟ یہ دنیا تو اُمّید پر قائم ہے، جب ہم کسی کی اُمّید پوری نہ کر سکیں تو وہ ہماری مدد کیوں کرے۔''۲۱

قید کا احساس بجائے خود دل شکن ہوتا ہے اس پر احساس تنہائی، احساس ندامت، احساس گناہ، جیل حکام کا ذلت آمیز رویہ، رہائش وخوراک کی ناقص سہولتیں انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس ماحول سے کچھ مفاہمت ہو جاتی ہے لیکن اسیری کا ابتدائی زمانہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ حمید اختر اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''اُس چار دیواری میں چٹائی بچھا کر مٹی کے لوٹے کو سامنے رکھ کر جب میں لیٹا تو پہلی بار اس تنہائی کے احساس نے مجھے ڈس لیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن انہیں پیتے ہوئے میں نے جیسے اپنے آپ سے مذاق کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ''حمید اختر! اگر کھجوریں بھی ہوتیں تو شاید تم پیغمبر ہو جاتے۔''۲۲

بعض مصنفین بوجوہ اسیری کے شدائد کا بیان نہیں کرتے خصوصاً جب حبسیہ نثر خطوط کی صورت میں ہو تو اس بیان کی نوعیت دوسری اصناف سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو خطوط اسیری کے دوران لکھے جاتے ہیں جس میں قیدی کی جذباتی کیفیت رہائی کے بعد لکھی جانے والی حالت سے مختلف ہوتی ہے۔ دوسرے خطوط کے مکتوب الیہ سے مصنف کا تعلق بھی مختلف مزاج کا تقاضا کرتا ہے مثلاً فیض احمد فیض کی کتاب صلیبیں مرے دریچے کے تمام خطوط ان کی اہلیہ کے نام ہیں۔ عموماً کوئی شخص اپنی بیوی کے سامنے اپنی کمزوری، خوف یا تکلیف کا واضح اظہار نہیں کرتا جبکہ اس کی بیوی اس کی عدم موجودگی سے پریشان بھی ہو۔ اس لیے فیض نے اسیری کے مصائب اور شدائد کا بالکل ذکر نہیں کیا، بلکہ اگر کوئی اور انہیں ایسی بات بتائے تو فیض وضاحت کرتے ہیں کہ ایسی بات نہیں اور وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

اس معاملے میں وقت تحریر بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زمانہ اسیری میں لکھی جانے والی تحریر اور اس واقعے کے بہت عرصے بعد لکھی جانے والی تحریر میں جذباتی کیفیت مختلف ہوتی ہے مثلاً ابوالکلام آزاد نے ''غبارِ خاطر'' کے خطوط میں کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا لیکن آخری عمر میں لکھی جانے والی انگریزی کتاب India Wins Freedom میں لکھتے ہیں:

"Most of the time, I spent in the Ahmednagar jail was passed under conditions of great mental strain when I was arrested, my weight was 170 lbs. when I was transferred from Ahmednagar I was 130 lbs." ۲۳

دراصل یہ حبسیہ نثر کی خصوصیت ہے کہ مصنف بوجوہ اسیری کے شدائد کو نہیں بیان کرتا۔ اس کی وجہ معاشرتی یا گھریلو

بھی ہوسکتی ہے۔جیسا فیض کے معاملے میں ہوا۔ آزاد کے معاملے میں اس کا سبب ان کی سیاسی پس منظر بھی ہوسکتا ہے۔ آزاد برصغیر کے ممتاز رہنما تھے۔ ان خطوط میں اگر وہ اسیری کے مصائب کا بیان کرتے تو یہ ان کی سیاسی ساکھ اور ہندوستانیوں کے عزم و ارادے کے لیے نقصان دہ ہو ثابت ہوسکتا تھا۔ مجموعی طور پر یہ موضوع حبسیہ نثر کا اہم حصہ ہے۔شعوری یا لاشعوری طور پر تمام مصنفین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۔اسیری کے مثبت پہلو:

جہاں اسیری کے تلخ تجربات کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں اہل نظر کے نزدیک اس کے کچھ فوائد بھی ہیں سب سے زیادہ چیز جو آزاد دنیا کی نسبت جیل میں فراواں ملتی ہے وہ وقت ہے۔ اس فرصت اور تنہائی میں انسان زندگی، دوسروں اور اپنے متعلق سوچ سکتا ہے جاوید ہاشمی کے مطابق:

> ''نباتات، حشرات الارض، انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کا مطالعہ جتنا قریب سے جیل میں کیا جا سکتا ہے، باہر رہ کر شاید ممکن نہ ہو۔''۲۴

فیض کے بقول:

> ''جیل خانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تحیر اور نزاکتِ احساس جو پختہ عمر میں آدمی کھو بیٹھتا ہے دوبارہ لوٹ آتی ہے۔''۲۵

شورش کاشمیری نے نمبر وار اسیری کے بارہ فوائد گنوائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔　میں خود اعتماد ہو گیا۔

۲۔　مجھے مطالعہ کا عادی بنا دیا۔

۳۔　میری فکر کو یکسوئی بخشی۔

۴۔　میں نے اپنے لیے سیاسی جدوجہد کا میدان متعین کر لیا۔

> ''لیڈروں کے متعلق میرا تصور پرستش کی بجائے پرسش کا ہو گیا۔''۲۶

اسیری کے یہ مثبت پہلو انسان کی مذہبی، معاشرتی اور نفسیاتی تبدیلی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔عملی طور پر دیکھیں تو اس کے ثمرات تحریر کی صورت میں ہی نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض کا شعری مرتبہ مسلّم ہے لیکن اسیری نے ان کی شاعری میں ''زنداں نامہ'' اور ''دست صبا'' کا اضافہ کیا جس کا بڑا حصہ زنداں کے تجربات سے لیا گیا ہے۔

صدیق سالک کے ادبی سرمائے کی اولین اور بہترین کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' اسیری کی عطا ہے۔ شورش کاشمیری نے قیام پاکستان کے بعد جیلوں کی مختصر اسیری میں اپنی کئی کتابیں مکمل کیں۔ حمید اختر کی سب سے مشہور کتاب ''کال کوٹھڑی'' قید سے متعلق ہے۔ انہیں بجا طور پر اسیری کے ثمرات کہا جا سکتا ہے۔

قید میں اکثر لوگ مطالعہ کرتے ہیں جس سے ذہنی ترفع ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی قرأت ان کے تراجم اور تفاسیر کا مطالعہ بھی جیل کا مثبت پہلو ہے۔ مذہبی رجحان کے لوگ تو اس نوع کے مطالعے کے عادی ہوتے ہیں لیکن جیل میں جا کر ہر مزاج کے لوگ مذہبی کتابیں پڑھتے ہیں۔ قید میں انسان کو بہت تکلیف دہ صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تکلیف آزادی کے بعد

دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

۳۔نظریہ اسیری:

اسیری کے دور رس اثرات کو محسوس کر کے تقریباً ہر مصنف اسیری سے متعلق اپنا ایک نظریہ قائم کرتا ہے کہ اس کے نزدیک قید کسے کہتے ہیں اور اسیری نے اُس پر کیا اثر ڈالا۔ شورش کاشمیری قید کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''قید بظاہر سنگ وخشت میں رہنے کا نام نہیں انسان اپنے دن ہر طرح کاٹ لیتا ہے۔قید نام ہے انسان کی اپنی مرضی کے ٹوٹنے اور پرائی مرضی کے چلنے کا۔ انسان نہ اپنی مرضی سے مسکرائے نہ اپنی مرضی سے سوئے، نہ جاگے، نہ پیے، نہ کھائے، نہ پھرے، نہ اٹھے، نہ بیٹھے، نہ بولے۔ یہ ہے قید اور اسی کا نام قید ہے۔''۲۷

شورش کا نظریہ اسیری ظفر علی خان کے خیالات سے بے حد متاثر ہے جو شورش کے ان کی متعلق لکھی کتاب ''قید فرنگ'' میں ملتا ہے۔مولانا کے بقول:

''قید مشقت کرنے یا نہ کرنے کا نام نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان وہاں اس قسم کی مشقت میں جوتا جاتا ہے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہوتی ہے لیکن قید نام ہے انسان کی اپنی مرضی کے ختم ہو جائے گا۔''۲۸

قید میں رہ کر جہاں انسان کچھ مثبت خصوصیات اپناتا ہے وہاں منفی تجربات کا حصول زیادہ سہل ہے۔ نامساعد حالات میں محدود جگہ پر، انجان لوگوں کے ساتھ رہنا یقیناً جھنجھلاہٹ بے زاری اور خفگی کا باعث بنتا ہے جس کا اظہار مصنفین نے بہت کم کیا ہے کیوں کہ رہائی کے بعد انسان اچھی باتوں کو یاد رکھتا ہے اور تلخ یادوں کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ صدیق سالک اپنی آپ بیتی ''سلیوٹ'' میں لکھتے ہیں:

''قید بڑی ظالم شے ہے۔ یہ انسان کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ ہر لحاظ سے ننگا، جسمانی لحاظ سے بھی اور اخلاقی لحاظ سے بھی یعنی ایک تو ایک دوسرے کے سامنے کپڑے بدلنے سے کسی کا کسی سے ستر نہیں رہتا اور دوسرے یہ کہ متواتر ساتھ رہنے سے ہر کسی کا اندرونی عکس بھی سامنے آ جاتا ہے۔ آپ پیاز کے چھلکے اور نلکے کے پانی پر جھگڑا کرنے سے لے کر ملکی مسائل کے بارے میں ردعمل سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔''۲۹

فیض احمد فیض کی منفرد شخصیت انہیں حبسیہ نثر میں بھی منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ اپنی شاعری کی طرح نثر میں بھی دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں۔اسیری کے متعلق لکھتے ہیں:

''جیل میں آنے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ اسیری کوئی شجاعانہ اور بلند مرتبہ بات ہے۔ اب پتہ چلا کہ اس میں نہ شجاعت کا کوئی مضمون ہے، نہ عالی حوصلگی کا۔ اس میں صرف درد ہے اور ناقابل بیان درد اور اس درد کا صحیح احساس مجھے ایک گرفتار شکاری پرندے سے ہوا۔''۳۰

ماضی پرستی اور ناسٹلجیا بھی قید میں ایک اہم رویہ ہوتا ہے قید میں رہ کر انسان کو ماضی کی آزاد دنیا بہت ہی سہانی لگتی ہے یہ رویہ خصوصاً آپ بیتی میں نمایاں ہوتا ہے جو عام حالات میں لکھی آپ بیتی میں بھی ہوتا ہے۔خصوصاً جیل میں لکھی آپ بیتی میں انسان خود کو، اپنے خاندان کو اور اپنی پچھلی زندگی کو بہت خوب صورت انداز میں یاد کرتا ہے۔ یہاں اس کا رویہ تانگے کی پچھلی

نشست پر بیٹھے مسافر کی طرح ہوتا ہے جسید ورہ جانے والا منظر زیادہ حسین اور پرکشش معلوم ہوتا ہے-
شاہ زمانی بیگم اپنی والدہ کے نام خط میں نظریہ اسیری کے متعلق لکھتی ہیں:

''اس ملک (برما) کی زبان اَور ہے- رہنا سہنا، کھانا پینا، سب ہم سے اجنبی ہے- وہ جانتے بھی نہیں کہ ہم کون ہیں اور یہاں ہم کو کیوں قید کیا گیا ہے- اماں جی! ہماری یہ قید ایسی قید ہے کہ نہ ہم قید ہیں، نہ آزاد ہیں، نہ زندہ ہیں، نہ مردہ ہیں- اپنے گھر میں، اپنے شہر میں، اپنے ملک میں جا نہیں سکتے، اس لیے قیدی ہیں، طوق و زنجیر گلے میں اور پاؤں میں نہیں ہے، اس لیے آزاد ہیں- دوستوں اور قرابت داروں سے جُدا ہیں، اس لیے مردہ ہیں، بولتے چالتے، کھاتے پیتے ہیں، اس لیے زندہ ہیں- کہاں تک لکھوں، سائیں سبیل شاہ کی زبانی سب حالات معلوم ہو جائیں گے- سیّدہ سلطانہ کو گود میں لینا، سینے سے لگانا، منہ چومنا اور کہنا کہ پھپھو کا پیار لو- ابّا حضرت کو یاد نہ کرو! ہمیں بھی بھول جاؤ! نہ وہ ملیں گے، نہ ہم ملیں گے- وہ قبر میں ہیں اور ہم بھی قبر میں ہیں، اُن کی قبر وطن میں ہے مگر ہماری قبر پردیس میں ہے جب تک ہم زندہ ہیں قبر میں ہیں، جب مر جائیں گے تب بھی قبر میں ہوں گے-

آداب امّاں جانی! تسلیم!
خالی گود والی!
آپ کی بیٹی!''[۳۱]

جو مصنفین قید تنہائی میں رہے ہیں وہ اگر بعد میں ساتھیوں کے ساتھ رہیں یا پہلے ساتھیوں کے ساتھ رہ کر بعد میں تنہائی میں رہیں وہ قید تنہائی کو اصل قید سمجھتے ہیں- ساتھیوں کے قرب سے غم بھی بٹ جاتا ہے- یہ انسانی فطرت بھی ہے کہ اگر مصیبت میں دوسرے لوگ بھی ساتھ ہوں تو آدھی تکلیف یہ سوچ کر ختم ہو جاتی ہے کہ اس مصیبت میں ہم اکیلے نہیں فیض احمد فیض کی چار سال سے زائد کی اسیری میں اولین تین ماہ قید تنہائی کے تھے- ان کے خطوط میں اگر اسیری کی تکلیف کا ہلکا سا اشارہ ملتا ہے تو وہ اسی قید تنہائی کے متعلق ہے- صدیق سالک نے بھی بھارتی قید میں پہلے تین ماہ قید تنہائی میں کاٹے- اس کے بعد جب وہ کیمپ میں آئے تو ان کے قلم میں افسردگی اور وحشت کی جگہ شگفتگی نے لے لی تھی-

۴- مذہبی رجحان:

قید خانہ ایسی جگہ ہے جہاں دنیا سے کٹ کر بے بسی اور بے اختیاری میں خدا کی بہت یاد آتی ہے- زیادہ تر حبسیہ مصنفین اسیری میں مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں- مذہبی رہنما تو جیل سے باہر بھی مذہب سے قریب ہوتے ہیں- جیل کی تنہائی انہیں مذہبی مطالعے کا زیادہ وقت فراہم کرتی ہے- مثلاً مولانا مودودی نے جیل سے ہی قرآن کریم کی تفسیر کی پہلی جلد مکمل کی- پروفیسر خورشید احمد نے جیل میں اپنے ساتھیوں سمیت مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا- یہ تو مذہبی شخصیات تھیں جیل میں عام انسان بھی مذہب سے قریب ہو جاتے ہیں- صدیق سالک قید تنہائی کی اندھیری کوٹھڑی میں پڑھی جانے والی نماز کے متعلق لکھتے ہیں:

''اندھیری رات کی گھمبیر تنہائی میں قیام طویل اور سجدے طویل تر ہوتے گئے- رکوع کے لیے کمر جھکاتا تو

دل پہلے جھک جاتا، سجدے کے لیے جبیں بچھاتا تو اٹھنے کو جی نہ چاہتا- نماز کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا- اِیّاکَ نعبد و ایاک نستعیکا جو مفہوم اس کال کوٹھڑی میں سمجھ آیا، کبھی کوئی خطیب کوئی مفسر کوئی واعظ نہ سمجھا سکا-'' ۳۲

جاوید ہاشمی نے جیل میں قرآن مجید کا ترجمہ عربی گرامر کے ساتھ مولوی صاحب سے پڑھا- فیض احمد فیض نے جیل میں روزہ رکھنے کا ذکر اپنی بیوی سے یقین دلانے کے انداز میں کیا ہے- حبسیہ مصنفین میں صرف حمید اختر ایسے شخص ہیں جن کی مذہبی حالت پر کوئی فرق نہیں پڑا- اس کا پس منظر سلیم احمد کی لکھی ان کی سوانح عمری میں ملتا ہے ۳۳ کہ حمید اختر کو گھر والوں نے ان کی مرضی کے خلاف دینی مدرسے میں داخل کرایا- وہ حافظ قرآن بنے لیکن جوانی میں مذہبی پابندیوں کے خلاف ہو گئے اس لیے وہ حافظ قرآن ہونے کے باوجود قید تنہائی میں کسی آیت کی تلاوت یا خدا رسول کا ذکر کرتے دکھائی نہیں دیتے-

مذہبی رجحان میں اسلامی تاریخ کے رخشندہ ناموں کو یاد کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے خصوصاً پروفیسر خورشید احمد نے امام ابوحنیفہ، امام حنبل، امام تیمیہ کی قید اور تشدد کر ذکر کے کے اپنے اندر ہمت پیدا کی ہے- اس کے علاوہ حق پرستی کے لیے شورش کاشمیری امام حسین علیہ السلام کی مثال دیتے نظر آتے ہیں- لیکن کسی بھی حبسیہ نثر نگار نے زنداں کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے امام حسینؓ کے اہل خانہ کی شام کے زنداں میں اسیری کا ذکر نہیں کیا جو قید خانہ اتنا تنگ و تاریک تھا کہ دن کو بھی سورج کی روشنی نہیں آتی تھی- جہاں اسیری کے شدائد سے امام حسینؓ کی چار سالہ صاحبزادی بی بی سکینہ انتقال کر گئیں تھیں- حبسیہ نثر نگاروں کے لیے مشترک تکلیف کی بنا پر اس موضوع کا ذکر موثر ثابت ہوسکتا تھا لیکن یہ ذکر کہیں نہیں ملتا- اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُس قید میں امام حسینؓ کے صاحبزادے امام زین العابدینؓ کے علاوہ سب اسیر خواتین اور بچے تھے جن کی تکلیف اور بے بسی کی نوعیت مردوں سے مختلف تھی اور واحد مرد اسیر امام زین العابدینؓ کی بیماری اور بھاری طوق بھی حبسیہ نثر نگاروں کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

۵- بے گناہی - اُمید:

اسیری کے اعصاب شکن دور میں اُمید کا دامن تھامے رکھنا ایک مشکل کام ہے لیکن تاریکی میں روشنی کی واحد کرن بھی اُمید ہی ہوتی ہے- اخلاقی قیدی جو کسی جرم کے نتیجے میں آئے ہوں ان کی ذہنیت یقیناً سیاسی قیدیوں سے مختلف ہوتی ہے جن کے جرم کا تعین معروضی انداز میں کرنا مشکل ہے- تقریباً تمام سیاسی قیدی خود کو حق پر سمجھتے ہیں- کتابوں کے نام بھی اس سوچ کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً جاوید ہاشمی کی ''ہاں میں باغی ہوں'' میں وہ اپنے اوپر لگنے والے الزامات کے بے وقعتی ظاہر کرنے کے لیے اس ''بغاوت'' کو قبول کرتے ہیں- فیض کی کتاب کا نام ''صلیبیں مرے دریچے میں'' صلیب کا لفظ ان کے کرب، سچائی اور بے گناہی کو ظاہر کرتا ہے- یوسف رضا گیلانی کی کتاب ''چاہ یوسف سے صدا'' اُن پر ہونے والے مظالم کا استعارہ ہے- ناکردہ گناہوں کی سزا پانے والے زیادہ تکالیف کا شکار ہوتے ہیں لیکن اُن کا ضمیر انہیں مطمئن رکھتا ہے اور وہ مستقبل کی امید پر حال کے دکھوں کو بھلاتے ہیں سب سے زیادہ اُمید کا اظہار فیض احمد فیض کے ہاں ملتا ہے لکھتے ہیں:

''جب سے میں یہاں پہنچا ہوں خوف وخطر کا قطعی احساس دل میں باقی نہیں رہا (اگرچہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا وہ اس وجہ سے کہ نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جسے اخلاقی طور

پر گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسے ارتکاب بھی نہیں جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے۔)''۳۴

حبسیہ نثر کے مصنف میں اگر اُمید نہ ہوتو اس کے ہاں شدید درد وغم اور قنوطیت کا تاثر ابھرتا ہے یہ ایسا احساس حمید اختر کی ''کال کوٹھڑی'' میں ملتا ہے جہاں دور دور تک اُمید کا پیغام نہیں۔ اس کے برعکس صدیق سالک کی ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں اُمید کا رنگ بہت حاوی ہے۔ دراصل وہ ایک فرد کی اسیری نہ تھی۔ نوے ہزار قیدی یقیناً امید بہار رکھتے تھے۔ اسی لیے ڈھائی سال کی اسیری میں تمام نامساعد خبروں کے باوجود شجر سے پیوستہ رہے۔ سالک لکھتے ہیں:

''مجھے اس منجدھار میں اکثر سوہنی کی مثال یاد آتی جو دریائے چناب کی بپھری ہوئی لہروں سے صرف اس لیے نبرد آزما رہتی کہ دریا کے اُس پار اُس کا مہینوال اس کا منتظر ہوگا۔ گویا جو چیز اسے ڈوبنے سے بچائے رکھتی تھی وہ گھڑا نہیں، بلکہ مہنیوال کا تصور اور جذبۂ وصل تھا۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ سرحد کے اُس پار ایک مہینوال نہیں، بلکہ ہزاروں لاکھوں عشاق منتظر راہ ہوں گی۔ ان سے وصل کی گھڑی آئے گی اور ضرور آئے گی۔''۳۵

حبسیہ نثر کے المیہ موضوعات میں اُمید کا مضمون تازگی اور رعنائی عطا کرتا ہے۔

حبسیہ نثر کی تاریخ کا یہ جائزہ جہاں اس نثر کی ادبی خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے۔ وہاں یہ مصنف کی ذات کے ساتھ اس کے عہد سے بھی کچھ واقفیت دلاتا ہے۔ اس کے ذریعے اسیری میں مصنف کی ذہنی کیفیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اسیری ایک خارجی تجربہ ہے لیکن یہ اسیر کو اپنی داخلی دنیا سے آشنا کرتا ہے۔ مختلف افراد میں اس کے اثرات بقدرظرف مختلف ہوتے ہیں جو حبسیہ نثر میں بھی واضح اظہار کرتے ہیں ۔ اس لحاظ سے حبسیہ نثر اردو نثر میں ممتاز ہے کہ دوسری اصناف کی نسبت اس میں مصنف کی شخصیت اور مزاج کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

حواشی:

۱۔ ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' از ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء، ص ۱ کے مطابق آپ بیتی کی دو قسمیں ہیں:

(الف): (مکمل آپ بیتی) اس قسم کی آپ بیتیاں عمر طبعی کے قریب پہنچ کر لکھی جاتی ہیں۔

(ب): (نامکمل حالات زندگی) مثلاً زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کا بیان، زندگی کے صرف ایک دور کا بیان، صرف ایک سال کا روز نامچہ، زندگی کے ایک پہلو مثلاً سیاسی ادبی یا علمی زندگی کا بیان، ایک یا چند سفروں کا بیان جسے وہ خود بیان کرے۔''

اس تعریف کے مطابق حبسیہ نثر میں آپ بیتی کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف): ایسی آپ بیتی جن کے مکمل یا غالب حصے میں حبسیہ کیفیات کا بیان ہوتا ہے مثلاً حسرت موہانی کی ''قید فرنگ''، شورش کاشمیری کی ''پس دیوار زنداں''، ظفر اللہ پوشی کی ''زندگی زنداں دلی کا نام ہے''، صدیق سالک کی ''ہمہ یاراں دوزخ''۔

(ب): ایسی آپ بیتی جس میں زندگی کے دوسرے واقعات کے ساتھ اسیری کا مختصر یا مفصل تذکرہ آتا ہے مثلاً دیوان

سنگھ مفتون کی ''نا قابل فراموش''، یوسف رضا گیلانی کی ''چاہ یوسف سے صدا''۔عبدالغفار خان کی ''آپ بیتی''۔

۲۔ ابوالکلام کی آزاد کی ''غبارِ خاطر''، سجاد ظہیر کی ''نقوش زنداں''، فیض احمد فیض کی ''صلیبیں مرے دریچے میں''۔خطوط کے مجموعے ہیں جو جیل سے لکھے گئے۔

۳۔ صدیق سالک کی ہمہ یاراں دوزخ جسے ظہور احمد اعوان نے اپنی کتاب داستان ''رپورتاژ نگاری'' پشاور، ادارہ علم و فن، ۱۹۸۹ء، ص۱۲۷۔۱۳۷ میں رپورتاژ قرار دیا ہے۔

۴۔ سوانح عمری کی ذیل میں مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب ''سفر نامہ اسیر مالٹا'' آتی ہے جو اُن کی مصر اور مالٹا کی اسیری کی کہانی ہے جو انہیں تحریک خلافت سے وابستگی کے نتیجے میں بھگتنی پڑی لیکن داستان اسیری کے ساتھ مولانا نے اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی شخصیت، عظمت اور بہادری کا خصوصی ذکر کیا ہے اس لیے کتاب کا دوسرا نام ''حیات شیخ الہند'' رکھا۔

۵۔ ''سفر نامہ مالٹا'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں قید کے سلسلے میں پیش آنے والے سفر کا بیان کیا گیا ہے۔ درج بالا معنوں میں سوانح عمری کے ساتھ یہ سفر نامہ بھی ہے جس میں مختلف ملکوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' بھی سفر نامے کی ذیل میں آتی ہے۔ جس میں انہوں نے جزیرہ انڈیمان میں گزرے اٹھارہ سالوں کے تجربات کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ انٹرویو کی ذیل میں شورش کاشمیری کی کتاب ''قید فرنگ/ظفر علی خان'' آتی ہے۔ اس کتاب میں شورش نے ظفر علی خان سے سوالوں کی صورت میں ان کی اسیری کی کہانی دریافت کی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ظفر علی خان نے طویل قید کاٹنے کے باوجود اپنی اسیری کی نثری کیفیات کو کتابی شکل نہیں دی۔

''جالب بیتی'' حبیب جالب کی زندگی کی کہانی ہے جس میں اسیری کے واقعات کا بھی بیان ہے لیکن یہ کتاب جالب کی علالت کے زمانے میں ان سے کی گئی گفتگو پر مبنی ہے جسے آڈیو کیسٹ کی صورت میں ریکارڈ کیا گیا۔

۷۔ یہ خط رسالہ صحیفہ شمارہ ۱۸۸، ۱۸۹ کے مضمون ''رنگون میں آخری مغل شہنشاہ'' از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مترجم ڈاکٹر خالد ندیم سے لیا گیا ہے جس میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ اس اہم خط کی نقل کے لیے وہ خواجہ حسن نظامی کے ممنون ہیں۔ اس خط کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنگ آزادی کے فوراً بعد لکھا گیا ہوگا، کیوں کہ اُس میں کرب، درد، بے کسی، غیر مانوس ماحول سے اجنبیت کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ پھر اس میں شاہ زمانی بیگم کے بھائی کی پھانسی کا حال بھی انہیں نامہ بر کے ذریعے ملتا ہے۔ اگرچہ یہ باقاعدہ قید نہیں جلاوطنی تھی لیکن شہنشاہ ہند کے اہل خانہ کی وطن سے دور چھوٹے سے مکان میں کسمپرسی کی زندگی کی کرب ناک تضاد کو جنم دیتی ہے۔ مکتوب نگار نے جلاوطنی کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کثرت سے متعلقات اسیری کا ذکر کیا ہے۔

۸۔ حمید اختر، کال کوٹھڑی، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۹، ص: ۱۲۸

۹۔ شورش کاشمیری، تمغہ خدمت، لاہور، مکتبہ چٹان، ۱۹۷۸، ص: ۶۳

۱۰۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۲، ص: ۵۷

۱۱۔ ظفر اللہ پوشنی، زندگی زنداں دلی کا نام ہے، کراچی، میل ہیڈن انٹرنیشنل، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۳

۱۲۔ جاوید ہاشمی، تختہ دار کے سائے تلے، لاہور، جہانگیر بکس، ۲۰۰۷، ص: ۱۵

۱۳۔ عبدالحمید اولکھ (مترجم) پاکستان میں جیلوں کے قواعد وضوابط، لاہور، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، ایوان جمہور، ص: ۱۴۶

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۲

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۴۰

۱۶۔ شورش کاشمیری، پس دیوار زنداں، لاہور، مکتبہ چٹان، ۱۹۸۹، ص: ۱۲۶

۱۷۔ حمید اختر، کال کوٹھڑی، ص: ۱۰

۱۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مضمون ''آپ بیتی، مشمولہ ''نقوش آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴، ص: ۶۱

۱۹۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص: ۱۰۰

۲۰۔ حمید اختر، کال کوٹھڑی، ص: ۶۰

۲۱۔ حمید اختر رائے پوری مضمون ''رنگون میں آخری مغل بادشاہ،، مشمولہ رسالہ صحیفہ، شمارہ ۱۸۸، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۹۷۔۲۹۸

۲۲۔ حمید اختر کال کوٹھڑی، ص: ۱۵

۲۳۔ Abulklam Azad. India Wins Freedom, Bombay, Longmans, 1959, p. 97

۲۴۔ جاوید ہاشمی، تختہ دار کے سائے تلے، ص: ۶۰

۲۵۔ فیض احمد فیض، صلیبیں مرے دریچے میں، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۱، ص: ۲۹

۲۶۔ شورش کاشمیری، پس دیوار زنداں، ص: ۱۵۴

۲۷۔ شورش کاشمیری، پس دیوار زنداں، ص: ۱۲۶

۲۸۔ شورش کاشمیری، قید فرنگ، ظفر علی خان، لاہور، مکتبہ چٹان، ۱۹۶۷، ص: ۷۷

۲۹۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص: ۱۷۵

۳۰۔ فیض احمد فیض، صلیبیں مرے دریچے میں، ص: ۲۰۳

۳۱۔ شاہ زمانی بیگم، خط، مشمولہ رسالہ، صحیفہ، ص: ۲۹۸

۳۲۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص: ۶۸

۳۳۔ سلیم احمد، سوانح عمری حمید اختر، لاہور، بک ہوم، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۵۹

۳۴۔ فیض احمد فیض، صلیبیں مرے دریچے میں، ص: ۳۰

۳۵۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص: ۲۰۱